باب۔۲۷

ترجمہ

فص محمدیہؐ

حکمت فردیہ

سرّ ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، فردیت ہے۔ اس لیے کہ آپؐ اس نوعِ انسانی کے کامل تر فرد ہیں۔ لہٰذا حقیقتاً نبوت آپؐ ہی سے شروع ہوئی اور آپؐ ہی پر ختم ہوئی۔ آپؐ نبی تھے اور آدمؑ ہنوز آب و گل میں تھے (یعنی آدمؑ ابھی تشکیل کے مرحلے میں تھے)۔ پھر (آپؐ) اپنی نشاءت و خلقتِ عنصری کے لحاظ سے خاتم النبیین ہیں۔

اوّل افراد کا تین کا عدد ہے۔ اس کے سوا جتنے افراد ہیں اسی فرد اوّل سے صادر ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب پر پہلی دلیل ہیں۔ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم یعنی کلّیات و اصول عطا کیے ہیں۔ وہ جوامع الکلم کیا ہیں۔۔؟ حقائق و منمیاتِ اسمائے آدم ہیں۔ جس طرح قیاس میں تثلیث ہے، یعنی اصغر، اوسط، اکبر۔۔۔ یا صغریٰ، کبریٰ، نتیجہ۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی "تثلیث" ہے، (تین خصوصیات ہیں)۔ ۱) احدیت۔ ۲) وحدت۔ اور ۳) عین الاعیان یا معلوم کلّی اجمالی۔

دلیل اپنے آپ پر دلیل اور بدیہی (یعنی جسے کسی دلیل کی حاجت نہ ہو) ہوتی ہے۔ یعنی شکل اوّل میں جو مرجع اشکال ہے۔ چوں کہ آپؐ کی حقیقت، فردیتِ اولیٰ کو پیدا کرتی ہے اور اس کی ترتیب میں تثلیث ہے اس لیے آپؐ نے محبت کے متعلق، جو اصلِ وجود ہے، فرمایا (کہ) مجھے تمھاری دنیا سے تین چیزیں محبوب ہیں کیوں کہ اس میں " تثلیث " ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا، عورتیں، خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ حضورؐ نے پہلے عورتوں کا ذکر فرمایا اور بعد میں نماز کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت اپنی اصلِ ظہور میں مرد کا جزو ہے۔ معرفت، انسان کی (اور) خود کی، معرفتِ رب سے مقدم ہے۔ اور معرفتِ رب، نتیجہ بہ معرفتِ نفس خود ہے۔

اسی لیے حضورؐ نے فرمایا،من عرف نفسهٗ فقد عرف ربّهٗ،[یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو جانا [(حدیث۔کتب الصوفیہ)]۔اب چاہو تو تم یہ کہو کہ کوئی شخص نہ اپنے نفس کی حقیقت جان سکتا ہے،نہ رب تعالیٰ کی۔اس سے وصول الی اللہ کا ممتنع ہونا ثابت ہوتا ہے۔چاہو تو یہ کہو کہ جو اپنے نفس کو جتنا جانے گا اتنا ہی رب تعالیٰ کو بھی جانے گا۔میری احتیاج،رب کے محتاج الیہ ہونے پر دال ہے۔میرا امکان اس کے وجوب پر۔میرا عدم اس کے وجود پر روشن دلیل ہے۔پہلی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم خود کو نہیں جان سکتے تو خدا کو کیوں کر جانو گے۔دوسری صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ تم خود (کو) بھی جانتے ہو اور خدا کو بھی۔ہر شئے اللہ تعالیٰ پر دلیل ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفریست،معرفت کردگار (سعدیؒ)

(ایک باخبر اور ہوشیار شخص کی نظر میں ہرے بھرے درختوں کی ہر شاخ اور ہر ہر پتہ اللہ کی معرفت کا ایک دفتر ہے)

تمام دلائل میں سے واضح تر دلیل،ذاتِ محمدیؐ ہے کیوں کہ عالم کا ہر جزو اپنی اصل پر دال ہے۔سب کی اصل کیا ہے۔۔؟رب تعالیٰ شانہٗ۔اس کو خوب سمجھو۔یہ عورتوں کی محبوبیت کیوں ہے۔۔؟کُل کو جزو محبوب ہی ہوتا ہے۔اس سے حق تعالیٰ کے متعلق بھی ایک بات معلوم ہوئی جو اس نشاءت عنصری کے متعلق فرماتا ہے،وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي،(یعنی)میں نے اس میں اپنی روح پھونکی،(الحجر:۲۹اورص:۷۲)۔پھر بیان فرمایا کہ وہ انسان کی ملاقات کا بڑا مشتاق ہے۔وہ اپنے مشتاقوں کے لیے فرماتا ہے،اے داؤد!میں ان کا بہت مشتاق ہوں،یعنی اپنے مشتاقوں کا۔

دریا پکارتا ہے ادھر دیکھ اے حباب

تیرے لیے میں تیری طرح بے قرار ہوں

یہ ایک لقائے خاص و ملاقاتِ مخصوص ہے(کہ)"بے مرے کے خدا نہیں ملتا"حضور ﷺ حدیثِ دجال میں فرماتے ہیں،"تم میں کا کوئی شخص جب تک نہ مرے اپنے خدا کو نہیں دیکھ سکتا"۔جس کی صفت یہ ہوگی(کہ)وہ ضرور مشتاق ہوگا۔اللہ تعالیٰ کا شوق بھی اپنے مقربوں کے لیے اسی قدر ہے۔باوجود یہ کہ حق تعالیٰ اپنے عاشقوں کو دیکھتا ہے تو وہ بھی حق تعالیٰ کو ضرور دیکھنا چاہیں گے۔مگر مقام دنیا،دیدارِ حق سے مانع ہے۔یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے حق تعالیٰ فرماتا ہے،حَتّٰى نَعْلَمَ،(یعنی)یہاں تک کہ میں جان لوں،(محمد:۳۱)۔باوجود یہ کہ حق تعالیٰ

عالم ہے وہ اس صفتِ خاص و طریقۂ مخصوص کے طور پر ملاقات کا شوق رکھتا ہے، جو بعدِ موت ہو گی۔ اُس وقت عاشقوں کے شوق کو بھی تسکین ہو گی۔۔ حدیث قدسی جس میں حق کا تردّد مذکور ہے وہ بھی اسی قسم کا ہے۔۔۔ ارشاد ہے" کوئی کام مجھے کرنا ہے اس میں سے کسی میں مجھے تردّد نہ ہوا جیسا مجھے مومن بندے کی قبضِ روح کے وقت ہوتا ہے۔ وہ مرنے کو مکروہ سمجھتا ہے، اور میں اس کی ناخوشی کو مکروہ جانتا ہوں۔ مگر اس کا مجھ سے ملنا بھی ضروری ہی ہے"۔ اپنے عاشق کو اپنے وصال و ملاقات کی بشارت دی اور یوں نہ فرمایا کہ اس کا مرنا ضروری ہے۔ تاکہ موت کے ذکر سے غمگین نہ ہو۔ چوں کہ بے مرے کے خدا نہیں ملتا، جیسے کہ حضورؐ نے فرمایا، تم میں سے کوئی شخص ہر گز اپنے رب سے نہ ملے گا جب تک مر نہ جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور میرا ملنا، میری ملاقات بھی ضروری ہے۔ غرض کہ اشتیاق، حق کا اس نسبت کے وجود کے لیے ہے۔

یحن الحبیب الیٰ رؤیتی

میرا دوست میرے دیدار کے لیے بے قرار و مشتاق ہے

وانّی الیہ اشد حنینًا

اور میں اُس کے لیے اُس سے زیادہ مشتاق و بے قرار ہوں

وتھوی النّفوس ویابی القضا

نفوس کو دوست رکھتے مگر تقدیر انکار کرتی ہے

فاشکوالانین ویشکوالانینا

اِدھر میں آلہ و نالہ کرتا ہوں اور اُدھر وہ آہ و نالہ کرتا ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي، (یعنی) میں نے اس میں اپنی روح پھونکی، (الحجر:۲۹ اور ص:۷۲)۔ تو دَر حقیقت وہ اپنا آپ ہی مشتاق ہے۔ اللہ نے بندے کو اپنی صورت، اپنے ڈھنگ پر پیدا کیا۔ اس وجہ سے کہ بندہ اس کی روح سے ہے۔ چوں کہ اس کی نشاءت و خلقت اِن ارکان اربعہ سے ہے، یعنی آب (پانی)، آتش (آگ)، خاک (مٹی) اور باد (ہوا) سے۔۔ جو جسد میں پہنچ کر' اخلاط' کہلاتے ہیں، یعنی صفرا، خون، بلغم (اور) سودا۔ اس نفخ سے رطوبتِ غریزیِ جسد (یعنی جسم کے خون) میں ایک اشتعال پیدا ہوتا ہے جو حرارت غریزی (یعنی طبیعت میں گرمی) کا سبب ہے۔ پس اپنی نشاءت و خلقت کی وجہ سے روح کیا ہے، ایک شعلۂ آتش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے موسیٰؑ سے صورتِ آتش میں کلام کیا۔ اور ان کو آگ کی ضرورت لگادی۔ اگر انسان کی نشاءت و پیدائش طبیعی ہوتی یعنی غیر عنصری و آسمانی ہوتی تو اس کی روح نور ہوتی۔ روح کے ساتھ نفخ اور پھونکنا اس لیے فرمایا کہ اس میں نفسِ رحمانی کی طرف اشارہ کیا جائے یعنی یہ روح نفسِ رحمانی سے پیدا ہوئی ہے۔

یہ نفسِ رحمانی ہی ایک نفخ ہے جس سے روحِ انسانی اور اس کی حقیقت، خارج و عین میں ظاہر ہوئی اور منفوخ فیہ یعنی محل کی استعداد کے موافق روح و نفسِ رحمانی نار ہوئی، نور نہ ہوئی۔ پس نفسِ حق یا روحِ حق اُس چیز میں جا چھپی جس سے انسان، انسان ہے۔

پھر انسان ہی میں سے یعنی آدم میں سے اسی کی صورت شکل کے ایک دوسرے انسان یعنی حوّا کو پیدا کیا۔ پھر آدم کو حوّا کا اس طرح شوق پیدا ہوا جس طرح انسان اپنے جزو کو چاہتا ہے۔ اور حوّا، آدم کو چاہنے لگیں، جیسے کوئی اپنے وطن اور اصل کو دوست رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرد عورت سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ بھی اُس مخلوق کو دوست رکھتا ہے جو اُس کی صورت، اُس کے رنگ ڈھنگ پر ہے۔ اور ملائکہ نوری سے اس کو سجدہ کرا دیا۔ باوجود یہ کہ ان کی قدر و منزلت، ان کی خلقت و نشاءت طبیعی کے لحاظ سے عظیم الشان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ اور انسان کامل میں مناسبت ہے۔ صورت ہی سے مناسبت، اعظم و اجل و اکمل ہوتی ہے۔ یہی صورت انسانِ کامل، وجودِ حق کی جوڑی ہے، تصویر ہے، جیسے عورت اپنے وجود سے مرد کی جوڑی اور زوجہ بن گئی ہے۔

اس وقت تین چیزیں ظاہر ہوئیں۔ ۱) حق تعالیٰ۔ ۲) مرد۔ اور ۳) عورت۔ مرد آدمی اپنے رب کا مشتاق ہے، جو اس کی اصل ہے۔ جس طرح عورت مرد کی مشتاق ہے، جو اس کی اصل ہے۔ اللہ نے عورت کو مرد کا محبوب بنا دیا، جس طرح اللہ کی تصویر یعنی انسانِ کامل، اللہ کا محبوب ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مرد کو اپنی فرع، اپنے جزو سے محبت ہے یعنی عورت سے۔ اور خدائے تعالیٰ کو مرد سے محبت ہے جس سے مرد وجود میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حبّب، میرے دل میں محبت ڈال دی گئی، اور یہ فرمایا (کہ) میں محبت کرتا ہوں یعنی خدا کو جس کی صورت میں آپ ہیں۔

منظور یہ تھا ظہور سے حضرتؐ کے
بندے بھی تو دیکھ لیں خدا کی صورت

حاصل یہ کہ محبت ایک فطری، غیر اختیاری شئے ہے۔ حضورؐ کا، انسانِ کامل کا، اپنی بیوی کو چاہنا بھی اتباعِ خداوندی ہے کہ خدا نے اپنی فرع، یعنی مرد کو چاہا تو مرد نے بھی اپنی فرع یعنی عورت کو چاہا۔۔۔ تخلقوا باخلاق اللہ، (یعنی) اللہ کے اخلاق پیدا کرو۔

جب مرد کو عورت کی محبت فطری و لازمی ہے تو اس نے وصال اور بالکل ایک ہو جانے کو چاہا۔ اس نشاءت عنصری اور مادّی دنیا میں پیوند ہو جانے، ایک ہو جانے، کا طریقہ نکاح کے سوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

شہوت و شوق تمام اجزا میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی واسطے نہانے کا حکم دیا گیا تا کہ طہارت بھی کامل ہو۔ اس لیے کہ وقتِ شہوت اس پر فنا عام (ہو جاتی ہے)، اور بے خودی چھا (جاتی ہے)۔ حق تعالیٰ اپنے بندے پر بڑا غیور ہے (کہ) کیوں بندے نے غیر خدا کی طرف توجہ کی! کیوں سمجھا کہ وہ غیر خدا سے لذت پا رہا ہے! لہٰذا اس کو غسل کا حکم دے کر پاک کر دیا۔ تا کہ عورت جس میں فنا ہو گیا تھا اس میں بھی توجہ الی الحق کرے۔ یہی غفلت عن اللہ تو موجبِ غسل ہے۔ جب مرد عورت میں حق کو مشاہدہ کرے، اس کی طرف توجہ رکھے، تو یہ منفعل، معمول (اور) متاثر میں شہود ہے۔ مشاہدہ ہے۔ اگر خود میں حق کو دیکھے اس نظر سے کہ عورت اُس سے پیدا ہوئی ہے تو یہ فاعل میں مشاہدۂ حق ہے۔ اگر حق کو خود میں دیکھے اور اپنی فرع (یعنی شاخ)، عورت کی صورت کا خیال نہ رہے تو اس وقت مرد منفعل اور حق فاعل و متصرف بالواسطہ ہے۔ غرض یہ کہ مرد کا، حق کو، عورت میں مشاہدہ کرنا اتم و اکمل ہے۔ اس وجہ سے کہ اس وقت حق کو خود باعتبار فاعل کے، عورت میں باعتبار منفعل کے، نیز خود میں اس اعتبار سے کہ حقِ فاعل و موثّر اور خود منفعل (اور) متاثر ہے، مشاہدہ کرتا ہے۔۔۔ اسی لیے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے بہت محبت کی، کیوں کہ عورتوں میں شہودِ حق، کامل طور پر ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ ((کا) مواد سے مجرّد ہو کر (یعنی الگ کر کے) کبھی نہیں مشاہدہ کیا جاتا۔ اس لیے کہ اس اعتبار سے وہ تمام جہاں سے مستغنی ہے۔ حق تعالیٰ کا مادّے سے پاک ہو کر مشاہدہ نہیں ہو سکتا، اور مشاہدہ ہو سکتا ہے تو صرف مادّے میں، تو عورتوں میں شہودِ کامل ہوتا ہے۔ اتحاد، وصال اور فناسب نکاح میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ نظیر ہے مخلوقات پر توجہ الٰہی کی۔ خصوصًا انسانِ کامل پر کہ اس کی صورت پر ہے کہ وہ خلیفۂ حق ہے۔ حق تعالیٰ اس میں اپنی صورت دیکھے کیوں کہ وہ تصویرِ قدرت ہے، (اس نے) انسان کو صاف و درست کیا (اور) اس کے جسد میں اپنی روح پھونکی۔

کیا فرشتوں کو خبر تھی کہ یہ خاکی پتلا
جان پڑتے ہی طلسمات کا پتلا ہو گا

مرد کا ظاہر، خلق ہے اور باطن حق ہے۔ اسی لیے روح، مدبّرِ بدن ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی روح کے توسط سے تدبیر کرتا ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک، اعلیٰ علیین (یا برتر) سے لے کر اسفل السافلین (یا کم تر) تک۔ کیوں کہ اجزاے عالم میں سے بظاہر سب سے پست زمین ہی ہے۔ عورتوں کو عربی میں نسا کہتے ہیں۔ یہ صیغہ جمع کا ہے۔ اس کا واحد اس کے مادّے سے نہیں ہے، بلکہ امرأۃ ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے تمھاری دنیا میں سے تین چیزیں محبوب ہیں، نسا یعنی بیویاں۔ اور یہ نہیں فرمایا، امرأۃ یعنی عورت۔

عورتوں کے تاخّر اور بعد پیدا ہونے کی رعایت کی۔ کیوں کہ نسا کے معنی تاخیر کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ،[(یعنی) مہینے کو ہٹادینا (آگے پیچھے کر دینا) کفر میں زیادتی ہے،(التوبہ:۳۷)]۔ اور بیع بہ نسیہ (یعنی) اُدھار خریدنے میں بھی تاخیر ہے۔ اسی وجہ سے لفظ 'نسا' فرمایا۔ لہٰذا انسانِ کامل اپنی بیوی کو مرتبے کی وجہ سے ہی دوست رکھتا ہے۔ اس لیے کہ وہ محلِ انفعال ہے۔ عورتیں مردوں کے لیے ایسی ہیں جیسے طبیعت، حق کے لیے ہے (اور) جس توجہ ارادی اور امر الٰہی سے صور عالم نمایاں ہوئے ہیں۔ یہ امر الٰہی ایسا ہے جیسے نکاح، عالم صور عنصری میں، اور ہمّت، عالم ارواح نورانی میں۔ اور صغریٰ و کبریٰ کا ملنا انتاج میں۔ یہ سب گویا نکاح ہے، فردیت اولیٰ، یعنی تثلیث کا ان سب صورتوں میں۔

جو اپنی بیویوں کو اس طریقے اور حیثیت سے محبت کرے تو وہ خدا ہی کی محبت ہے۔ اور جو صرف شہوتِ طبیعی کی غرض سے محبت کرے تو اس کو اس محبت کا علم صحیح ہی نہیں ہے۔ وہ ایک قسم کا حیوان ہے جو سرّ وراز محبت سے جاہل ہے۔ اس کی محبت صورتِ بے روح ہے۔ اگرچہ یہ صورت، نفس الامر میں جاندار ہے مگر اُس جاہل کو کیا مشہود و معلوم ہوگی جو اپنی بیوی کے پاس آتا ہے، یا کسی اور عورت کے پاس آتا ہے، چاہے کوئی ہو، صرف شہوت رانی (اور) لذت یابی کی خاطر۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ یہ طلب کس کی ہے۔ یہ شوق کس کے لیے ہے۔ یہ اپنے حال سے اتنا ہی جاہل ہے۔ ناواقف ہے جتنا اس کا غیر اس کے حال سے ناواقف ہے۔ جب تک وہ اپنے منہ سے نہ کہے اور اس کے غیر کو علم نہ ہو۔ او نادان! سمجھ۔۔ منبع الوجود، حقیقتِ عشق، (اور) محبتِ ذاتی ہی مرد میں محبت بن کر جلوہ گر ہے۔ اور عورت میں محبوب بن کر نمودار ہے۔ بعض شعرا نے کہا ہے۔

صحّ عند النّاس انّی عاشق
لوگوں کو اتنا تو ثابت ہو گیا کہ میں عاشق ہوں
غیر انّ لم یعرفوا عشقی لمن
مگر انھیں کیا معلوم میں کس کا عاشق ہوں

اسی طرح شہوت ران، لذت طلب، لذت کا طالب ہے تو اس کے محل عورت کا بھی طالب ہے۔ مگر افسوس! وہ روح مسئلہ مغز سخن سے جاہل ہے۔ جانتا تو معلوم ہوتا کہ کون کس سے لذت پا رہا ہے۔ اس وقت وہ انسانِ کامل ہوتا، مردِ عاقل ہوتا۔

مرد سے عورت پیدا ہوئی۔ اس لیے اس کا مرتبہ مرد سے پست ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (یعنی) مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے،(البقرۃ:۲۲۸)۔۔ اسی طرح مخلوقات کا مرتبہ

بھی خالق کے مرتبے سے کم ہے گو کہ خالق ہی کی صورت اور اس کے کمالات کا ظہور ہے۔ حق تعالیٰ کا وہ مرتبہ و درجہ جس کی وجہ سے وہ مخلوق سے ممتاز ہے، اسی کی وجہ سے عالمین سے غنی ہے، صمد و بے نیاز ہے۔ وہ فاعلِ اوّل ہے، اور صورت فاعلِ ثانی ہے۔ پس حق تعالیٰ کو جو اوّلیت ہے وہ مخلوق کو نہیں۔

جب اعیان و حقائق باعتبار مراتب کے ایک دوسرے سے ممتاز ہیں تو عارف ہر مستحق کو اس کا حق ادا کرتا ہے۔ اسی لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بی بیوں سے محبت کرنا، محبت الٰہی پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شئے کو اس کی استعداد کے موافق عطا کرتا ہے یعنی اس کا حق عطا کرتا ہے۔ حکیم علی الاطلاق ہر شئے کو اس کے استحقاق کے مطابق دیتا ہے۔ یعنی ہر شئے کے اقتضائے ذات و حقیقت کے مطابق دیتا ہے۔ یہی عین حکمت ہے۔

دیتا ہے ہر ایک کو حکیم جس کی جیسی لیاقت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نسا کے ذکر کو مقدم کیوں کیا۔۔؟ تین محبوب چیزوں میں عورت کو پہلے کیوں بیان فرمایا۔۔؟ اس لیے کہ عورت، محلِ انفعال اور قابلِ اثر ہے، اور قابل، مقبول سے پہلے ہوتا ہے۔ جیسے کہ طبیعتِ کل ہر شخصِ طبعی سے، یعنی اس شئے سے کہ طبیعتِ کل سے مخصوص صورت میں موجود ہوئی۔ یہی طبیعت، اسمائے الٰہی کے تاثیرات قبول کرتی اور اعیان عالم علوی و سفلی کو شامل اور ان کے استعدادات کو حاوی ہے۔ یہ طبیعتِ کلّیہ کیا ہے۔۔؟ نفسِ رحمانی ہے۔ اسی میں عالم کی صورتیں اعلیٰ سے لے کر اسفل تک نفخ کی گئی ہیں، یعنی ڈالی گئی ہیں۔ کیوں کہ نفخ رحمانی عالم اجرام و اجسام کے جوہر ہیولانی و مادّی میں جاری و ساری ہے۔ اور نفخ الٰہی کا سریان، ارواحِ نورانی و اعراض میں ایک دوسرے سے سریان ہے۔ پھر حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تانیث کو تذکیر پر غالب فرمایا۔ حضورؐ کا مقصد، عورت کی اہمیت ظاہر فرمانا ہے۔ لہٰذا آپ نے ثلٰثٌ فرمایا، ثلٰثۃٌ نہ فرمایا۔ عربی میں ثلٰثٌ عورت کے لیے اور ثلٰثۃٌ مرد کے لیے آتا ہے۔ باوجود یہ کہ اس میں طیّبٌ کا لفظ بھی ہے جو مذکر ہے۔ حالاں کہ عربوں کی عادت ہے کہ مذکر کو مونث پر غالب کرتے ہیں۔ عرب لوگ کہتے ہیں، عورتیں اور زید نکلے (یا) گئے۔ اور (یہ) نہیں کہتے، نکلیں (یا) گئیں۔ مذکر کو مونث پر غالب کیا اگرچہ مذکر ایک ہے اور اور مونث جمع ہے۔ آپؐ تو عرب تھے، افصح العرب و العجم (یعنی عرب و عجم سب میں فصیح تر) تھے۔ تانیث کو تذکیر پر غالب کرکے آپ نے ایک معنیٰ خاص کی رعایت اور قصد فرمایا۔ اور وہ مشاہدۂ حق میں اہتمام ہے۔ اگر یہ اہتمام نہ ہوتا تو ماسوائے حق یعنی بیوی سے محبت ہی نہ کرتے۔ (یہ) آپ کو معلوم نہ تھا، اِس کی تعلیم اللہ نے دی۔ حضورؐ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ اس لیے تو آپؐ نے تانیث و تذکیر پر تغلیب اور ثلٰثٌ فرمایا نہ کہ ثلٰثۃٌ۔۔۔ ماشاء اللہ۔ حضورؐ حقائق کو کس قدر جاننے والے ہیں اور حقوق کی کس قدر رعایت فرمانے والے ہیں۔

پھر آخر میں مثلِ اول کے مونث لفظ ہی لائے۔ یعنی پہلے نسا (عورت) کا لفظ تھا، وسط میں طیّبٌ (خوشبو) کا لفظ، اور آخر میں صلاۃ (نماز) کا لفظ۔ نسا وصلاۃ دونوں مونث ہیں۔ ان دو مونث لفظوں میں طیّبٌ کا لفظ مذکر ایسا ہے جیسے آپؐ، ذاتِ مقدسہ اور عورت کے درمیان۔ ذاتِ مقدسہ سے مرد، اور مرد سے عورت ظاہر ہوئی ہے۔ ذاتِ مقدسہ میں تانیثِ لفظی اور امراۃ وعورت میں تانیثِ حقیقی ہے۔ اسی طرح نسا میں تانیثِ حقیقی ہے اور صلاۃ میں تانیثِ لفظی ہے۔ طیّبٌ مذکر ہے، جو ان دو مونثوں کے درمیان مذکور ہے۔ جیسے آدم ذاتِ مقدسہ اور حوّا کے درمیان، کہ آدم ذاتِ مقدسہ سے پیدا ہوئے، اور حوّا آدم سے پیدا ہوئیں۔ اب چاہو تو انسان، ذات سے پیدا ہوا کہو، یا صفت سے، یا قدرت سے۔ یہ سب الفاظ، مونث غیر حقیقی ہیں۔ جو طریقہ اختیار کرو، مونث غیر حقیقی، آدم سے یا انسان کامل مقدم ہوگی۔ دنیا کے علل و معلول کے پھندے میں پھنسے ہوئے بھی۔ (اور) جو حق تعالیٰ کو علت عالم وعلۃ العلل سمجھتے ہیں، وہ بھی تو یہی مرجع کی طرف سمجھتے ہیں۔ جو لفظ علّت ہے (وہ بھی) مونث ہے۔

حضورؐ نے نسا اور عورت کے بعد طیّبٌ وخوشبو کا ذکر کیوں فرمایا۔۔؟ عورت میں مرد خود اپنی خوشبو محسوس کرتا ہے کیوں کہ وہ مرد سے بنی ہے۔ عربی مثل ہے، الطیّبُ الطیّبُ عُناق الحبیب، (یعنی) بہترین خوشبو، دوست سے گلے ملنا ہے۔۔۔ معانقۂ یار نہ کہ گلاب کا ہار۔

رسول مقبولؐ اصلی بندے پیدا ہوئے تھے تو آپؐ نے کبھی سرکشیِ سردار نہ کی۔ ہمیشہ سر بسجود تھے۔ بندگی سرافگندگی میں تھے۔ اور دائماً اللہ تعالیٰ سے منفعل ومتاثر تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ سے کیا کیا پیدا کیا۔! آپ کو رتبۂ فاعلیت و تاثیر عطا کی۔ آپ کے تاثیرات عالم ارواح وانفاس میں ہیں جو نہایت عطر آمیز ہیں۔ پس خوشبو آپؐ کو پسند تھی۔ اسی لیے آپ نے نسا کے بعد ہی خوشبو کا ذکر فرمایا۔ اسی لیے آپؐ نے حق تعالیٰ کے درجات کا لحاظ رکھا اور ان کی مراعات کی، رعایت کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، رَفِیعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ، (یعنی) بلند مراتب و درجات والا، صاحبِ عرشِ حکومت ہے، (غافر:۱۵)۔ وہ اپنے اسم رحمٰن سے سب پر چھایا ہوا ہے۔ سب اس کی رحمانیت کا غلبہ ہے۔ اس کے زیرِ عرش جتنے ہیں، جو کچھ ہے، سب کو اس کی رحمانیتِ الٰہی سے حصہ ملتا ہے۔ (وہ) فرماتا ہے، وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (یعنی) میری رحمت میں سب کی سمائی ہے، (الاعراف:۱۵۶)۔ اس کا تختِ حکومت ہر شئے کی وسعت رکھتا ہے۔ رحمان، حاکم علی الاطلاق ہے۔ وہ سب پر مستوی (درست کرنے والا) و مستولی (بالادست) اور غالب (چھایا ہوا) ہے۔ اس کی حقیقت تمام عالم میں جاری وساری ہے۔ اس مسئلے کو ہم نے اِس فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ میں متعدد

دفعہ بیان کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے طیبؔ وخوشبو کو اس ارتباط نکاح میں سیدتنا عایشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برأت میں بیان فرمایا ہے،الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَـٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ،[(یعنی)خبیث عورتوں کے لیے خبیث مرد، اور خبیث مردوں کے لیے خبیث عورتیں ہیں، اور اچھی عورتیں ہیں اچھے مردوں کے لیے،اور اچھے مرد ہیں اچھی عورتوں کے لیے، یہ منافق لوگ جو کچھ کہتے ہیں، یہ(پاکیزہ)لوگ اس سے مبرّا و پاک ہیں،(النّور:۲۶)]۔اللہ تعالیٰ نے ان کی باتوں کی ہوا کو خوشبو فرمایا۔کیوں کہ بات بھی سانس ہے۔اور وہی بُو ہے۔سانس میں سے خوشبو اور بدبو دونوں نکلتی ہیں۔خوش بُو (اور)بدبو،بات کی صورت ہے۔اچھی بات معطر ہوتی ہے اور بُری بات مکروہ(و)بدبودار۔

یہی سانس جب بلا واسطہ منسوب الی اللہ ہو تو طیبؔ اور خوشبودار بھی ہے اور شرعی مدح و ذم (یعنی تعریف و مذمت)کے لحاظ سے طیّب بھی ہے اور خبیث بھی ہے۔پاک بھی اور ناپاک بھی ہے۔ حضورؐ لہسن کے متعلق فرماتے ہیں"وہ ایک درخت ہے جس کی بدبو مجھے مکروہ معلوم ہوتی ہے"۔ آپؐ نے (یہ)نہیں فرمایا(کہ)میں اس سے کراہت کرتا ہوں۔کسی شئے کی ذات،مکروہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے آثار و صفات مکروہ ہوتے ہیں۔آثار وصفات کی وجہ سے کراہت کئی طریقے پر ہوتی ہے۔عرفاً یعنی سب لوگ اس کو بُرا سمجھتے ہیں یا طبیعت یا غرض یا شرع یا نقصان کمالِ مطلوب کی وجہ سے اس کو لوگ مکروہ سمجھتے ہیں۔بہرحال دنیا میں ان ہی اسباب کی وجہ سے کراہت پیدا ہوتی ہے۔

(پس)ثابت ہو چکا کہ اشیا کی دو قسمیں ہیں۔(۱)خبیث،بدبودار،ناپاک۔(۲)طیّب،خوشبودار، پاک۔اس لیے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو پاک (اور)خوشبودار شئے محبوب تھی اور ناپاک (اور)متعفن(یعنی بدبودار)چیز،نامرغوب۔

آپؐ نے فرمایا کہ بدبودار اشیا سے فرشتوں کو ایذا ہوتی ہے۔اس نشاءت عنصری و جسم مادّی ہی میں عفونت ہے۔کیوں کہ متعفن کیچڑ سے مخلوق ہے۔ قرآن شریف میں ہے،(لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ)مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ،{یعنی} آدم (جس کو تو نے بنایا ہے)کھنکھنانے والی اور بجنے والی مٹی سے،جس کی اصل، سڑی کیچڑ تھی،(الحجر:۳۳)۔اس لیے فرشتے بذاتہٖ متعفن شئے سے کراہت کرتے ہیں۔

دیکھو!جُعل یعنی غلاظت کے کیڑے کو اپنے مزاج کی وجہ سے بُوے گلاب سے ضرر ہوتا ہے۔جو شخص صورت سیرت،ظاہر باطن میں مثلِ جُعل کے ہو جائے تو حق بات اس کو بری لگتی ہے اور(وہ) باطل سے خوش ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّـهِ،(یعنی)جو لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں

اوراللہ سے کفر کرتے ہیں،(العنکبوت:۵۲)۔ان کی صفتِ ناکامی کے بارے میں فرماتا ہے،أُولَـٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ(یعنی)یہی لوگ ہیں نقصان اٹھانے والے،(العنکبوت:۵۲)۔[یہ کون لوگ ہیں ۔؟الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ،(یعنی) جنھوں نے اپنی جان کو نقصان پہنچایا،(الانعام:۱۲اور کئی آیات میں)]۔کیوں کہ جس کو نیک وبد کی تمیز نہیں وہ بے حس ہے، بے ادراک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر شئے میں سے طیّب و پاک ہی پسند تھا۔ حضورؐ کے پاس یہی چیز ہی تو تھی،یعنی خیر پسندی۔۔۔

کیا ممکن ہے کہ عالم میں کوئی ایسا مزاج ہو جو ہر شئے میں سے طیّب اور اچھے ہی کو لے، اور بد وناپاک کو جانے بھی نہیں۔۔؟اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی شخص جس نے بری چیز کو پایا بھی نہ ہو، جانا بھی نہ ہو، ممکن نہیں۔ دیکھو !خدائے تعالیٰ جس سے تمام عالم ظاہر ہوا ہے وہ بھی تو بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے (اور) بعض کو ناپسند۔ خبیث وبد وہی تو ہے جو مکروہ وناپسند ہو۔ اور طیّب و مرغوب وہی تو ہے جو محبوب و پسند ہو۔ ملائم طبع ہو۔ عالم صورتِ حق پر ہے، اور انسان محلِ خیر و شر دونوں ہے۔ یا انسان کو حق تعالیٰ اور عالم دونوں سے ارتباط ہے۔ لہٰذا عالم میں ایسی کوئی شئے، کوئی مزاج نہیں جو ہر شئے سے ایک ہی چیز کا ادراک کرے۔ بلکہ عالم میں بعض مزاج ایسے ہیں جو طیّب و خبیث اور خیر و شر کا ادراک کرتے ہیں، ان میں تمیز کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ ذوق کے ساتھ خبیث تو ہے اور بغیر ذوق کے طیّب ہے۔ وہ طیّب کے ادراک میں مشغول ہو کر خبیث کے احساس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔

لیکن عالم و موجودات سے خبیث کو بالکل خارج کر دینا، نکال دینا، یہ ناممکن ہے۔ رحمتِ الٰہی، خبیث و طیّب سب سے متعلق ہوتی ہے۔ خبیث کے پاس خبیث ہی طیب معلوم ہوتا ہے، اور اس کے پاس طیّب خبیث ہے۔ دنیا میں کسی شئے کو طیّب کہتے ہیں تو وہ خاص وجہ کے لحاظ سے (اور) خاص مزاج کے حق میں طیّب ہے۔ اور بالعکس (ہو تو خبیث ہے)۔

اب رہ گئی تیسری چیز،(جس) سے فردیتِ اولیٰ کی تصدیق ہوتی ہے یعنی نماز۔۔۔اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وجُعلت قرةُ عيني في الصلاة ، (یعنی)میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز کر دی گئی ہے(سنن النسائي، مسند احمد، عون المعبود، فتح الباري)۔ کیوں کہ صلاۃ مشاہدہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز اللہ اور بندے میں مناجات اور سرگوشی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ،(یعنی)تم میری یاد کرو میں تمھاری یاد کرتا ہوں،(البقرۃ:۱۵۲)۔صلاۃ و نماز کیا ہے ؟ایک عبادت ہے جو اللہ اور بندے میں منقسم ہے۔ ایک حصہ خدا کے متعلق ہے، ایک بندے کے متعلق۔۔ جیسے کہ صحیح حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، نماز مجھ میں میرے بندے میں نصفانصف تقسیم کی گئی ہے۔ اس میں سے آدھی تو میری ہے اور آدھی میرے بندے کی۔ بندہ جو مانگے گا اسے مل جائے گا۔

بندہ کہتا ہے،بِسْمِ اللّٰـهِ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ،(یعنی) میں شروع کرتا ہوں، یا کام کرتا ہوں، اللہ کے نام سے جس کی رحمت، امتنانی بھی ہے یعنی ابتدائی بلا معاوضہ، اور وجوبی بھی یعنی جزاے عمل۔ یا اس کی رحمت متعلق بہ عام بھی ہے اور رحمت متعلق بہ خاص بھی۔ یا رحمت، متعلق بر مومن و کافر دونوں ہے اور مختص بہ مومنین بھی ہے۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے بندے نے میری یاد کی، میرا ذکر کیا۔

بندہ کہتا ہے،الْحَمْدُ لِلَّـهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، تعریف تو تمام جہانوں کے پروردگار کی ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (کہ) میرے بندے نے میری حمد کی، میری تعریف کی۔

بندہ کہتا ہے،الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ، دنیا میں بھی وہی رحم کرنے والا ہے، اور آخرت میں بھی وہی رحم کرنے والا ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری صفت بیان کی، ثنا کی۔ میرے گُن گائے۔

بندہ کہتا ہے،مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ، روز جزا کا مالک ہے۔ قیامت کے دن جو کچھ ہو گا خدا ہی کا ہو گا۔ ۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، اور اپنے سارے کام میرے حوالے کر دیے۔۔۔ یہ پورا نصف سورۃ (سورۃ الفاتحہ) خالص خدا کا ہے۔

پھر بندہ کہتا ہے،إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، بندگی کرتے ہیں، انتہائی خاکساری دکھاتے ہیں۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، تجھ ہی کو اپنا کارساز بناتے ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے۔ بندہ جو مانگے گا اس کو دیا جائے گا۔۔۔ یہ آیت مشترک ہے۔

بندہ کہتا ہے،اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ،صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ، ہم کو سیدھا راستہ دکھا، چلا ان لوگوں کا راستہ جن کو تو نے نعمت دی، انعام و اکرام سے سرفراز کیا، نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب اترا ہے، بداعتقاد ہیں، بے دین ہیں، یا یہودی ہیں، اور نہ ان لوگوں کا راستہ جو گمراہ ہیں، بدکردار ہیں، گناہ گار ہیں، نصرانی ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ آیتیں میرے بندے کے لیے ہیں۔ اور بندہ جو مانگے گا اُس کو مل جائے گا۔۔۔ یہ آیتیں خالص بندے کے لیے ہیں، جیسے کہ ابتدائی آیتیں خالص اللہ کے لیے تھیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ جس نے سورۃ الفاتحہ نہ پڑھی (گویا) اس نے وہ نماز نہیں پڑھی جو اللہ اور بندے میں منقسم ہے۔

چوں کہ نماز مناجات ہے، لہٰذا وہ ذکر ہے۔ یادِ الٰہی ہے۔ جس نے یادِ حق کی اس نے ہم نشینیِ حق حاصل کی۔ اور حق نے ہم نشینیِ بندہ کی۔ کیوں کہ خبر الٰہی یعنی صحیح حدیث قدسی سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، انا جلیس من ذکرنی، (یعنی) میں اُس کا ہم نشین ہوں جو میرا ذکر کرتا ہے، میری یاد کرتا ہے (حدیث۔ کتاب "المقاصد الحسنة فیما اشتهر علی الألسنة")۔ اور جو ہم نشینِ حق ہے جو اس کی یاد میں ہے، جو صاحبِ بصر و بینائی ہے، اپنے ہم نشین کو دیکھتا ہے۔ پس یہ مشاہدہ ہے۔ دیدار ہے۔ اگر ذاکر کی تیز بینائی نہیں قلبی بصیرت نہیں، تو وہ حق تعالیٰ کو نہ دیکھے گا۔

یہیں سے نمازی اپنے رتبے کو، اپنے مقام کو سمجھتا ہے۔ کیا اس کو دیدارِ حق ہے اس نماز میں یا نہیں۔ اگر اس کو مشاہدہ و دیدار نہیں تو ایمان ہی کے ساتھ عبادت کرے، گویا کہ وہ حق تعالیٰ کو دیکھتا ہے۔ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مناجات کے وقت اس کے قبلے کے درمیان ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ آرہا ہے اس کو کان لگا کر سنے ۔۔ اگر وہ اپنے عالم، انسان کا امام ہے تو ان فرشتوں کا بھی امام ہے جو اس کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ ہر آدمی جو کہ تنہا بھی نماز پڑھتا ہے وہ امام ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر آدمی تنہا نماز پڑھتا ہے تو فرشتے اس کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ بہر حال نمازی کو رتبۂ رسول ملتا ہے۔ یعنی اللہ کی نیابت و خلافت۔

جب بندہ، سمع اللہ لمن حمدہ، کہتا ہے یعنی سن لی اللہ نے اس شخص کی تعریف جو اس نے اللہ کی کی۔ جب یہ کہتا ہے تو وہ خود کو اور مقتدیوں کو سناتا ہے کہ اللہ نے اس کی تعریف کرنے کو سن لیا۔ پھر ملائکہ اور حاضرین مقتدی کہتے ہیں، ربّنا ولک الحمد، (یعنی) اے ہمارے پروردگار تعریف تیرے ہی لیے ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بندے کی زبان سے فرمایا، سمع اللہ لمن حمدہ۔

ذرا نماز کے مرتبۂ بلند کو دیکھو کہ اس نے نمازی کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ جس کو نماز میں درجۂ دیدار حاصل نہ ہوا وہ نہ مقصدِ نماز کو پہنچا، نہ نماز میں اس کو آنکھوں کی ٹھنڈک پیدا ہوئی۔ اس لیے کہ اس نے دیکھا ہی نہیں اس کو جس سے مناجات کرتا ہے۔ اگر دیدار سے بھی محروم ہے اور حق تعالیٰ کے پاس سے جو وارد ہوتا ہے اس کو سنتا بھی نہیں ہے تو وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کے لیے وارد ہوا ہے، أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ (یعنی) جس نے کان لگا کر سنا اور وہ حاضر دل بھی ہے، (ق:۳۷)۔ اور جو شخص نہ دیکھتا نہ سنتا ہے اور نماز میں اپنے رب کے پاس حاضر بھی نہیں ہے یعنی حاضر دل نہیں ہے تو وہ بالکل مصلّی نمازی ہی نہیں ہے اور نہ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ کا مصداق ہے۔

کوئی عبادت نماز کے سوا ایسی نہیں ہے جو غیر عبادت کام میں شغل و تصرف سے روکے۔ نماز میں اللہ کا ذکر بھی بہت بڑا ہے۔۔۔ کیوں کہ اس میں اقوال بھی ہیں (اور) افعال بھی ہیں۔ ہم نے فتوحات مکیہ میں،

نماز میں انسانِ کامل کا کیا حال ہوتا ہے، بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (یعنی) تحقیق نماز بے حیائی اور ناپسند افعال سے منع کرتی ہے، روکتی ہے، (العنکبوت:۴۵)۔ اس واسطے کہ حکم ہوا ہے کہ جب تک نماز میں ہے، نمازی کہلا رہا ہے۔ نماز کے سوا دوسرا کام نہ کرے۔ وَلَذِكْرُ اللَّـهِ أَكْبَرُ، (یعنی) اللہ کا اپنے بندے کو یاد کرنا بڑی چیز ہے، (العنکبوت:۴۵)۔ اللہ کا اپنے بندے کو یاد فرمانا سوال کا جواب دینا ہے۔ دعا کو قبول کرنا، بندے کی مدح و ثنا فرمانا، بندے کے خدا کی یاد کرنے سے بزرگ تر ہے۔۔۔ کیوں کہ کبریائی (اور) بزرگی اللہ جل وعلا کے لیے ہے۔ اسی لیے فرماتا ہے، وَاللَّـهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ، (یعنی) اور اللہ جانتا ہے تم جو کرتے ہو، (العنکبوت:۴۵)۔ اور فرماتا ہے، أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ، (یعنی) یا (اس نے) کان لگا کر سنا اور وہ حاضر دل ہے، (ق:۳۷)۔ نمازی کان لگا کر سنتا ہے (کہ) نماز میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کس طرح یاد فرماتا ہے۔

اسرارِ صلاۃ میں یہ بھی ہے کہ چوں کہ عالم کا وجود ایک عقلی حرکت تجلیِ الٰہیٰ سے ہے جو عالم کو عدم اضافی یعنی علم سے وجود کی طرف منتقل کرتی ہے، تو نماز بھی جمیع حرکات کو شامل وعام ہے۔

حرکات تین قسم کے ہیں:

(۱) حرکتِ مستقیم: وہ نمازی کی حالتِ قیام میں ہوتی ہے۔

(۲) حرکتِ افقی: وہ مصلی کی رکوع کی حالت میں ہوتی ہے۔

(۳) حرکتِ منکوسہ (یا) سرنگوں حرکت: اور وہ حالت، سجودِ مصلی میں ہوتی ہے۔

پس انسان کی حرکت، مستقیم (یا کھڑی) ہے، حیوان کی حرکت افقی (یا جھکی) ہے، اور نبات کی منکوسہ (یعنی آگے پیچھے) ہے۔ جماد کو تو حرکتِ ذاتی ہے ہی نہیں۔ اگر پتھر حرکت کرتا ہے تو بالغیر حرکت کرتا ہے۔ دوسرا اس کو متحرک کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا ہے، وجُعلت قرة عيني في الصلاة، یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں کر دی گئی ہے (سنن النسائي، مسند احمد، عون المعبود، فتح الباري)۔ آپؐ نے جُعلت فعل مجہول فرمایا۔ فعل کو اپنی طرف منسوب نہ فرمایا۔ کیوں کہ حق تعالیٰ کی تجلی، مصلّی کے لیے ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف راجع ہوگی، نہ کہ مصلّی کی طرف۔ اگر قرہ عین کی صفت و کیفیت اپنے لیے نہ فرماتے تو حق تعالیٰ آپؐ کو حکم دیتا کہ بغیر تجلیِ حق کے نماز پڑھیں۔ اس واسطے کہ تجلی بھی آپؐ کے لیے بطور امتنان کے تھی۔ یعنی ابتدائی اور کسی عمل کے مقابل نہ تھی۔ تو یہ مشاہدہ بھی بطور امتنان کے تھا۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا، وجُعلت قرة عيني في الصلاة، یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ محبوب کے مشاہدے کے سوا محب کی آنکھ ہرگز ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ عاشق کی آنکھ محبوب کے دیدار کے سوا کسی اور کو نہیں دیکھتی۔ نہ کسی شئے کی صورت میں، نہ کسی اور شئے میں۔

اس لیے ممانعت کی گئی ہے کہ نماز میں التفات نہ کرے یعنی اِدھر اُدھر نہ دیکھے۔ التفات سے شیطان بندے کی نماز کو اچک لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر اللہ کو محبوب سمجھتے (ہو) تو نماز میں قبلے کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر کیوں مڑ کر دیکھتے (ہو)۔۔۔ آدمی اپنے حال سے زیادہ واقف ہوتا ہے کہ یہ عبادتِ خاص اس مرتبہ و شہود پر ہے یا نہیں۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے)، الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ - وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ،(یعنی) آدمی اپنا حال خوب جانتا ہے، اپنے نفس کے باطن سے خوب واقفیت رکھتا ہے۔ اگرچہ لاکھ باتیں بنائے، عذر و معذرت کرے،(القیامۃ:۱۴، ۱۵)۔ (وہ) اپنے جھوٹ سچ کو خوب تمیز کرتا ہے۔ کوئی شخص اپنے حال سے جاہل نہیں رہتا۔ کیوں کہ حال اس کا ذوقی امر ہے۔

حقیقتِ صلاۃ کی دو قسمیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو حکم دیتا ہے کہ اس کی صلاۃ و نماز پڑھیں اور یہ بھی فرمایا کہ وہ بھی ہمارے لیے صلاۃ و رحمت فرماتا ہے۔ پس صلاۃ، طرفین (یعنی دونوں جانب) سے ہے۔ ہماری طرف سے بھی اور اُس کی طرف سے بھی۔ وہ صلاۃ بھیجتا ہے تو اس کا نام ہی جدا ہوتا ہے۔ اس کی تجلی وجود بندے کے بعد ہوتی ہے۔ وہ ایک لحاظ سے عینِ حق ہے۔ اس تجلی کو بندہ اپنے دل میں پیدا کرتا ہے، خواہ بہ نظر فکری یا تقلید۔ وہ معبودِ اعتقادی اپنے محل کی استعداد کے لحاظ سے نوع بنوع کا ہوتا ہے۔۔۔ کسی نے جنیدؒ (بغدادی) سے پوچھا، معرفتِ خدا کیا ہے۔۔؟ اور عارف کون ہے۔۔؟ تو فرمایا، لون الماء لون انائہ، یعنی پانی کا رنگ وہی نظر آتا ہے جو ظرف (یعنی برتن) کا رنگ ہوتا ہے۔ یہ ایک درست جواب ہے جو واقع کے مطابق ہے، نفس الامری ہے۔ یہ تجلیِ الٰہی ہے جو ہم پر صلاۃ و رحمت نازل فرماتی ہے۔ ہمارے اعتقاد کے مطابق اور ہمارے اعتقاد کے بعد ہوگی۔۔۔ ہم جب صلاۃ و نماز پڑھیں تو ہمارا نام دوسرا ہی ہوگا۔ اور ہم اس مقام میں ایسے ہوں گے جیسے مصلّی ہونے کی صورت میں تجلیِ الٰہی آخر تھی۔۔۔ پس ہم حق تعالیٰ کے پاس اپنے حسبِ حیثیت ہوں گے۔ وہ ہم پر نظر فرمائے گا تو ہمارے عقیدے کے موافق۔ اس واسطے کہ مصلّی میدان سباق اور گھوڑ دوڑ میں سابق کے بعد ہوتا ہے۔ عربی میں گھوڑ دوڑ کے، پہلے گھوڑے کو سابق، دوسرے کو محلّی (اور) تیسرے کو مصلّی کہتے ہیں۔ ان تین گھوڑوں کو انعام ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ،(یعنی) ہر ایک جانتا ہے اپنی صلاۃ اور تسبیح کو،(النّور:۴۱)۔ (گویا) ہر ایک جانتا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی عبادت کرنے میں ناقص و متاثر ہے۔ تسبیح و تنزیہ بھی کرتا ہے تو ایسی کہ اس کی استعداد کے لائق ہے۔ ہر ایک تسبیح کرتا ہے اپنے ربِّ حلیم و غفور کی حمد کے ساتھ۔

یہی وجہ ہے کہ ہم عالم کے تمام افراد کی بالتفصیل تسبیح نہیں سمجھتے۔ یہاں ایک اور صورت بھی ہے کہ ،وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ میں بِحَمْدِهِ کی ضمیر شئے کی طرف پھرے، اس وقت یہ معنیٰ ہوں گے کہ کوئی شئے ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو، اپنی حمد کے ساتھ،(الاسراء:۴۴)۔ یعنی وہ حمد و ثنا جو خود

اس تسبیح کرنے والے کی (ہے)۔ جس طرح کہ ہم نے اعتقاد رکھنے والے کے متعلق کہا کہ وہ اس معبود کی حمد و ثنا کرتا ہے جس کا وہ اعتقاد رکھتا ہے اور جس سے خود کو وابستہ کیا ہے۔ چوں کہ معبودِ اعتقادی، معتقد کا بنایا ہوا ہے، ایسے مصنوعی دیوتا کی تعریف حقیقت میں خود کی تعریف ہے۔ اس نے خود اپنی ثنا وصفت بیان کی، کیوں کہ مصنوع کی تعریف صانع کی تعریف ہے۔ مصنوع کا حسن و قبیح، صانع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اعتقادی معبود اس کے دیکھنے والے کا مصنوع ہے۔ اس کی صنعت ہے۔ اپنے اعتقادی معبود کی ثنا وصفت کرنا خود کی ثنا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے (کہ) آدمی دوسروں کے اعتقادی معبود کی مذمت کرتا ہے۔ اگر منصف مزاج ہوتا تو مذمت نہ کرتا۔ مگر معبودِ خاص کا عابد ہمیشہ جاہل رہتا ہے۔ وہ دوسروں پر، اپنے عقیدے کے خلاف ہونے کی وجہ سے، اعتراض کرتا ہے۔ اگر وہ جنیدؒ (بغدادی) کے اس قول کو سمجھتا، لون الماء لون انائه (یعنی پانی کا رنگ وہی نظر آتا ہے جو برتن کا رنگ ہوتا ہے)۔ ہر متعقد ایک قسم کا ظن رکھتا ہے۔ اس کو حقیقی علم ہی کب ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، انا عند ظنّ عبدی بی، (یعنی) میرا بندہ میرے متعلق جیسا گمان کرتا ہے میں ویسا ہی اس کے پاس رہتا ہوں، (حدیث قدسی۔ سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ، صحیح مسلم)، یعنی اس کے اعتقاد کے مطابق ظہور کرتا ہوں۔ چاہے مطلق رکھے یا مقید سمجھے کہ اس کو حدود گھیر لیں۔ یہ وہی معبود ہے جس کی سمائی بندے کے دل میں ہے۔ کیوں کہ معبودِ مطلق کسی ایک میں نہیں سماتا۔ اس لیے کہ وہ بندۂ خاص کا بھی عین ہے، اور سب کا بھی عین ہے۔ شئے کو کہا نہیں جاتا کہ وہ خود کو سماتا ہے یا نہیں سماتا۔۔۔وَاللّٰہُ یَقُولُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِي السَّبِیلَ، [(یعنی) اور اللہ حق بات فرماتا ہے اور سیدھا راستہ دکھاتا ہے، (الاحزاب:۴)]۔

تمّت بالخیر

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ

وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

Siddiqui Publications